تحمُّلِ امانت - مراتب اور تقاضے

ضبط و ترتیب: مفتی خالد نیموی قاسمی

حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کا ایک یادگار حکیمانہ خطاب

محدثِ جلیل حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ مؤرخہ ۱۷ ذوالحجہ ۱۴۲۱ھ کو قدیم دینی وملی تنظیم امارتِ شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ تشریف لائے۔ وہاں آپ نے سابق صدر مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نور اللہ مرقدہٗ کی عیادت فرمائی اور ذمہ دارانِ امارتِ شرعیہ کی خواہش پر آپ نے بعد نماز عشاء المعہد العالی ہال میں افتاء وقضاء کے طلبہ اور دار العلوم الاسلامیہ کے طلبہ سے انتہائی بصیرت افروز خطاب فرمایا۔ اجلاس کی صدارت دار العلوم دیوبند کے معزز رکن شوریٰ امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے کی اور نظامت کے فرائض بندہ خالد نیموی قاسمی نے انجام دیے۔ اس جامع دینی خطاب کو بندہ نے محفوظ کرلیا تھا۔ ترتیبِ جدید کے بعد افادۂ عام کے لیے شائع کیا جارہا ہے۔ (مرتّب)

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيدنا محمد النبي الأمين وعلى آلهٖ وصحبهٖ أجمعين!

انسان اشرف المخلوقات ہے، اس کی اشرفیت وافضلیت کی دلیل یہ ہے کہ اس نے اس بارِ امانت کو اُٹھالیا ہے، جس کا تذکرہ اس آیتِ کریمہ میں ہے:

’’إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسٰنُ إِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا‘‘ (الاحزاب:۷۲)

یعنی ’’بے شک ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی، تو انھوں نے اسے اُٹھانے سے انکار کردیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اُسے اُٹھالیا، وہ بے شک بڑا ہی ظالم، نادان تھا۔‘‘ (الاحزاب:۷۲)

اس آیتِ کریمہ کی تشریح وتفسیر کی آپ جیسے اہلِ علم کے سامنے چنداں حاجت نہیں۔ اس کے چند ٹکڑے اشارتاً ذکر کرتا ہوں، جس سے ساری آیت خود بخود سمجھ میں آجائے گی۔

امانت کیا ہے؟

مذکورہ آیت میں ایک محوری لفظ ہے: ''امانت''، ''إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ'' میں امانت کے معنی تقریباً وہی ہیں جو اردو میں ہیں، اردو میں امانت کہتے ہیں حفاظت کی ذمہ داری کو، کسی بھی چیز کی حفاظت کی ذمہ داری کو امانت کہتے ہیں۔ آپ حضرات انگریزی پڑھتے ہیں؛ اس لیے انگریزی لفظ استعمال کروں کہ رسپونسی بلیٹی (Responsibility) امانت کی انگریزی تفسیر ہے۔

مشہور حدیث ہے: ''لا إيمان لمن لا أمانة له''، ''جس شخص میں امانت نہیں ہے، اس میں ایمان نہیں ہے۔'' اس حدیث شریف میں امانت کا لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔ ایک شخص ہے، ہم نے اس سے ایک بات کہی، اس سے یہ کہا کہ بھائی صاحب! یہ بات کسی سے مت کہنا۔ اب یہ بات اس کے پاس امانت ہے، یعنی اس کی حفاظت کی ذمہ داری اس پر ہے، اب اگر وہ اس بات کو آگے بڑھاتا ہے، کسی دوسرے سے کہتا ہے تو یہ امانت میں خیانت ہے۔ ایک آدمی کے پاس آپ نے پیسہ رکھا، زر رکھا، سونا رکھا، چاندی رکھی، یا کوئی اور قیمتی چیز رکھی کہ میرا گھر محفوظ نہیں ہے، اس لیے اسے آپ رکھ لیں، میں سفر پر جارہا ہوں؛ اسے آپ رکھ لیں، یہ امانت ہے، یعنی اس چیز کی حفاظت کی ذمہ داری اس شخص پر ہے۔ یہ میں نے چند چیزیں ذکر کیں، تاکہ آپ لفظِ امانت کا مفہوم سمجھ سکیں کہ امانت کیا چیز ہے؟

کوئی چیز ہوتی ہے، اس کی حفاظت کی ذمہ داری کا نام امانت ہے، وہ چیز کیا ہے؟ وہ آپ حضرات سمجھتے ہیں۔

اللہ جل شانہ نے پہلے انسان ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم تک انبیاء کرام کے ذریعے آسمانوں سے جو ہدایت بھیجی، آسمانوں سے جو دین بھیجا ہے، یہی وہ عظیم شئے ہے، جس کی حفاظت کرنے کا نام امانت ہے، ظاہر ہے کہ یہ کوئی محسوس چیز تو ہے نہیں کہ مثلاً یہ گھڑی رکھی ہے، اسے بکسے میں بند کردیا، محفوظ جگہ رکھ دیا یا مثلاً چابی ہے تو اُسے جیب میں رکھ لیا، تاکہ گھڑی اور چابی کی حفاظت ہوجائے، یہ تو اس طرح کی چیز نہیں ہے۔ اللہ نے جو دین بھیجا ہے وہ اپنی جگہ پر حقیقت ہے، وہ ایک ایسی چیز ہے جس کی حفاظت کی شکل یہ نہیں کہ اُسے تالے میں بند کرکے جیب میں اس کی چابی رکھ لی جائے، بلکہ اس کی شکل کوئی اور ہے۔ یہ ایک لفظ، لفظِ امانت کی شرح ہے۔

عرضِ ''امانت'' کا مفہوم

دوسرا لفظ ہے: ''عَرَضْنَا'' یعنی پیش کیا ہم نے۔ پیش کرنا کیا ہے؟ کبھی مجلس میں تھالی لے کر کوئی ملازم آتا ہے، اس تھالی میں سونف ہے، چھالیہ ہے، لونگ، الائچی وغیرہ ہے اور سب کے سامنے گھماتا گھماتا لے چلتا ہے، جس کی خواہش ہے، اسے لے گا اور جسے خواہش نہیں وہ چپ چاپ بیٹھا رہے گا اور تھالی آگے بڑھ جائے گی۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہٗ نے حجة الله البالغة میں حضرت قاضی بیضاویؒ اور امام غزالیؒ کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے کہ پیش کرنے کا مطلب ''مخلوقات کی استعدادوں کے ساتھ موازنہ کرنا ہے'' کہ اس امانت کو اُٹھانے کی استعداد وصلاحیت کس میں ہے؟ یہ جو موازنہ کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ پیش کرنا ہے۔ ایسا کوئی محسوس نہیں ہے کہ اس امانت کو رکھ کر سارے مخلوق کے سامنے لے گئے ہوں، ایسا نہیں ہے۔ یہاں مفہوم معنوی طور پر پیش کرنا ہے اور وہ ہے استعدادوں کے ساتھ موازنہ کرنا۔

تحملِ امانت سے انکار

تیسرا لفظ ہے: ''فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا'' آسمانوں اور زمین نے اور پہاڑوں نے انکار کر دیا اس امانت کو اُٹھانے سے۔ مراد یہ تین ہی مخلوقات نہیں ہیں، یہ تو انسانوں کے سامنے جو بڑی بڑی مخلوقات ہیں، ان کا تذکرہ ہے۔ ''عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ'' فرمایا، آپ غور کیجئے! آپ اوپر نگاہ اُٹھائیے! کہ آسمان سے بڑی طاقتور دیرپا کوئی مخلوق نہیں ہے، پیروں کی طرف دیکھیے! تو زمین سے زیادہ مضبوط اور دیرپا کوئی دوسری مخلوق نہیں ہے اور بیچ میں آسمان کے نیچے فلک بوس پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں، معلوم نہیں کب سے کھڑے ہیں، جب سے زمین پیدا ہوئی کھڑے ہیں اور اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہو رہے ہیں؛ لہٰذا ان تین مخلوقات کی استعدادوں کے ساتھ موازنہ کرنے کا مطلب ہے تمام مخلوقات کے ساتھ موازنہ کرنا۔ کون سی مخلوقات مراد ہیں؟ تو سمجھیے کہ یہاں نورانی مخلوق یعنی وہ جو آسمانوں کے فرشتے ہیں وہ زیرِ بحث نہیں، اس سے مراد زمینی مخلوقات ہیں: چرند ہوں، پرند ہوں، کیڑے ہوں، مکوڑے ہوں، خاک کے ذرے ہوں، شجر ہوں، حجر ہوں۔ تمام مخلوقات کے سامنے یہ امانت پیش کی گئی، یعنی ان کی صلاحیتوں کے ساتھ موازنہ کیا گیا؛ چنانچہ دنیا کی کسی بھی مخلوق میں اس امانت کو اُٹھانے کی استعداد نہیں پائی گئی، یہ جو استعداد نہیں پائی گئی، یہی انکار کرنے کا مطلب ہے۔

یہ بات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی بیضاویؒ اور امام غزالیؒ کے حوالے سے لکھی ہے کہ اس آیت میں ''اِبَاء'' کا مطلب اباء طبعی ہے، یعنی ان میں سے کسی میں یہ استعداد نہیں پائی گئی۔ اباء اختیاری اور اباء قولی مراد نہیں؛ اس لیے کہ اباء قولی اگر کوئی مخلوق کرتی ہے تو وہ انسان کرتا ہے۔ انسان کے علاوہ

کوئی بھی مخلوق اباء قولی نہیں کرتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ اللہ کے لیے سجدہ ریز ہیں تمام چیزیں:

''اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ'' (الحج:۱۸)

یعنی ''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور تمام پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے آدمی، یہ سب اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے لوگ وہ (بھی) ہیں جن پر عذاب مقرر ہو چکا ہے اور جسے اللہ ذلیل کرے تو اسے کوئی عزت دینے والا نہیں، بیشک اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

یہاں نجوم، شجر اور جبال کے ساتھ ''وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ'' ہے، اس لیے کہ اباء قولی صرف انسان میں پایا جاتا ہے، دوسری کسی مخلوق میں یہ صفت نہیں پائی جاتی ہے۔ انسان کے علاوہ خدا کی جو مخلوق آسمان و زمین کے درمیان ہے، وہ ہمہ وقت اللہ کی تسبیح میں لگی ہوئی ہے، لہٰذا وہ مخلوق تو ہمہ وقت اللہ کی تسبیح خواں ہے، اس سے یہ اُمید کرنا، ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ انکار کرے، یہ درست نہیں ہوسکتا۔

''اَبَيْنَ'' کا مطلب ہے: اباء طبعی، یعنی موازنہ کرنے کے عمل سے یہ ثابت ہوا کہ کسی مخلوق میں اس امانت کو اُٹھانے کی صلاحیت نہیں ہے، اس کی حفاظت کرنے کی استعداد اُن میں نہیں پائی گئی۔

آیتِ کریمہ کا اگلا حصہ ہے: ''وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا'' پہلے یہ سمجھیے! کہ نہ پائے جانے کے بھی کئی درجے ہیں، کسی ایک چیز کے نہ پائے جانے کی استعداد کے بھی درجے ہیں، ایک درجہ ہے صفر اور ایک ہے زیرو صفر، یا پوائنٹ صفر یعنی سوواں حصہ بھی نہیں ہے اور پوائنٹ صفر یعنی ہزارواں حصہ بھی نہیں ہے۔ منطق کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں مطلق، یعنی مطلق استعداد اس میں نہیں پائی گئی۔ یہی ''اَشْفَقْنَ مِنْهَا'' کے معنی ہوئے۔

''وَحَمَلَهَا الْاِنْسٰنُ'' یعنی اس بارِ امانت کو اُٹھانے کی استعداد انسان میں پائی گئی، یعنی یہ پیش کرنا تو بدوِ کائنات یعنی ابتدائے آفرینش میں ہے، اللہ نے جب کائنات پیدا کی ہے، تو پیش کیا ہے، انسان تو ابھی وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔

حضرت قاری محمد طیبؒ کے حوالہ سے ''ظَلُوْمًا'' و ''جَهُوْلًا'' کی تفسیر

''اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا'': حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب رحمہ اللہ جو دار العلوم دیوبند کے مہتمم سادس ہیں، حجۃ اللہ البالغۃ کے درس میں اپنی طرف سے ''حکمتِ قاسمیہ'' کے وارث کے طور پر اضافات فرمایا کرتے تھے، ایسی باتیں عام طور پر ارشاد فرمایا کرتے تھے، جو اگرچہ حجۃ اللہ البالغۃ میں نہیں ہوتیں؛

لیکن اس کے مضامین کی ان سے تکمیل ضرور ہوتی تھی۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ: ''إِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا'' میں انسان کی تعریف کی گئی ہے۔ کس طریقے پر تعریف کی گئی؟ حضرتؒ فرماتے تھے کہ ''ظالم'' کے مبالغہ کا صیغہ ''ظلوم'' ہے۔ ''ظالم'' اُسے کہیں گے جس میں انصاف کرنے کی استعداد ہو اور وہ انصاف نہ کرے؛ اس لیے دیوار کو ظالم نہیں کہیں گے؛ اس لیے کہ اس میں انصاف کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اسی طرح ''جاهل'' اور ''جهول'' اسے کہا جائے گا، جس کی اصل شان تو یہ ہے کہ وہ علم حاصل کرے اور پھر وہ علم حاصل نہ کرے؛ بلکہ نرا جاہل اور گنوار رہ جائے، تو وہ ''جاهل'' ہے۔ اس کی ڈگری جب بڑھ جاتی ہے، تو وہ ''جَهول'' بن جاتا ہے۔ دیوار کو نہ تو جاہل کہہ سکتے نہ جہول، اس لیے کہ اس میں مطلق علم حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

مگر مردِ آفاقی در دو عالم نمی گنجد

اللہ تعالیٰ نے انسان کی جو تعریف کی ہے، اس کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ انسان علم اور عدل وانصاف کے پہلو پر چلے گا تو اتنی دور تک پہنچ جائے گا کہ کوئی اس کی خاک کو بھی نہیں پا سکے گا، اتنی دور چلا جائے گا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے کہا کہ:

عیاں گر دیدہ می گنجد نہاں در سینہ می گنجد
مگر مردِ آفاقی در دو عالم نمی گنجد

اور اگر خدانخواستہ انسان اس کی مقابل راہ اختیار کرے، جہالت کی راہ پر چلے، ظلم کے راستے پر چلے، تو اسے بھی کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ وہ اتنی دور جائے گا کہ ''جاهل'' نہیں، ''جهول'' ہو کر رہ جائے گا، ''ظالم'' نہیں ''ظلوم'' بن کر رہ جائے گا۔ ضدّین کی اس میں پوری صلاحیتیں ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ایک پہلو کو ذکر کیا اور اس کا مقابل پہلو مخاطبین کی فہم پر چھوڑ دیا کہ خود ہی سمجھنے کی کوشش کریں۔

قرآن کریم کا خاص اُسلوب

قرآن کا ایک خاص اُسلوب ہے کہ وہ بہت سی جگہوں پر آدھا مسئلہ بیان کرتا ہے اور آدھا حکمت کے تحت چھوڑ دیتا ہے۔ عام طور پر اسے مخاطبین کی فہم پر چھوڑ دیا جاتا ہے، ایسا موقع محل کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ ایک مثال دیتا ہوں کہ ایک جگہ پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۚ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ'' (آلِ عمران:۲۱)

ترجمہ: ''یوں عرض کرو: اے اللہ! ملک کے مالک! تو جسے چاہتا ہے سلطنت عطا فرماتا ہے اور جس

سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے اور تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے، تمام خیر تیرے ہی قبضۂ قدرت میں ہے، بیشک تو ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔'' (آل عمران:۲۱)

اس آیت کے اخیر میں فرمایا گیا کہ: تمام ''خیر'' اللہ کے قبضے میں ہے، سوال یہ ہے کہ ''شر'' کس کے قبضے میں ہے؟ اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ خیر وشر دونوں اللہ کے قبضہ میں ہیں، تو پھر آدھا مسئلہ بیان کر کے آدھے کو کیوں چھوڑ دیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ آدھے کو مخاطب کے فہم پر چھوڑ دیا گیا؛ اس لیے کہ یہ موقع اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرنے کا ہے اور اللہ کی تعریف کے موقع پر دوسری ضد کو بیان کرنا مصلحت کے خلاف ہے۔ اسی طرح کا مسئلہ ''شرح عقائدِ نسفیہ'' میں آپ نے پڑھا ہے، ''عذاب القبر حقٌ'' یعنی عذابِ قبر برحق ہے؛ لیکن یہ پورا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اس کے ایک حصہ کو چھوڑ دیا گیا ہے، اس لیے کہ قبر میں صرف عذاب ہی نہیں، بلکہ نیک بندوں کو نعمت بھی بہم پہنچائی جاتی ہے۔ حضرت حکیم الاسلام قاری طیب صاحبؒ فرماتے تھے کہ: اگر اس آیت میں برائی ہے، تو ان انسانوں کی برائی ہے، جو حق کی امانت ادا نہیں کرتے، لیکن جو مؤمنین حق کی امانت ادا کرتے ہیں، ان کی برائی اس میں نہیں ہے، بلکہ اس میں ان کی تعریف ہے۔

یہ آیتِ کریمہ کے چند اجزاء تھے، جو میں نے سمجھائے۔ اب آگے بڑھیے، یہ جو اُٹھانا ہے کہ انسان نے اس بوجھ کو اُٹھالیا، یہ منطقی اصطلاح میں کلّی مشکّک ہے، چوں کہ اُٹھانا معنوی ہے اور اس کے درجے الگ الگ ہیں، جس طرح احمر، ابیض واسود کے بے شمار درجے ہیں، اسی طرح اُٹھانے کے بھی بے شمار درجے ہیں۔

دو واقعات دو اسباق

دو حدیثوں کو ذہن میں لائیے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے غصہ اور طیش میں آکر اپنی گونگی باندی کو تھپڑ مار دیا۔ جلد ہی انھیں اپنے اس عمل پر پچھتاوا ہوا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، صورت حال کو بیان کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باندی کو بلوا کر پوچھا: ''أین الله؟'' یعنی اللہ کہاں ہے؟ اس نے اشارہ کیا کہ وہ آسمان میں ہے، آپ نے پوچھا: ''من أنا؟'' کہ میں کون ہوں تو وہ جواب میں، ''انت رسول الله'' نہیں کہہ سکتی تھی؛ بلکہ آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھایا، پھر آپ کی طرف اشارہ کر دیا، یعنی آپ اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ اس حدیث پر اشکال ہوتا ہے کہ اللہ تو مکان سے منزہ ہیں اور اللہ کے رسول اس کے جواب پر فرماتے ہیں: ''اعْتِقْها فإنها مؤمنةٌ'' تم اسے آزاد کر دو، اس لیے کہ وہ مومنہ ہے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ایمان کی گواہی دے رہے ہیں۔

دوسری حدیث یہ ہے کہ ایک جوان آدمی تھا جس نے اپنے اوپر ظلم اور گناہ کر رکھا تھا، جب اس کی موت کا وقت آیا، تو اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا کر آدھی راکھ کو خشکی میں اور آدھی کو سمندر میں پھینک دینا، تاکہ میں خدا کے عذاب سے بچ جاؤں؛ اس لیے کہ اگر خدا کا بس چل گیا تو وہ مجھے درد

ناک عذاب دے گا، اس لیے کہ میں نے بے تحاشا گناہ کیے ہیں۔ وہ شخص وصیت کر کے مرگیا، وصیت کے مطابق اس کی اولاد نے اس کے ساتھ ایسا ہی کیا؛ لیکن اللہ نے خشکی اور سمندر کو حکم دیا اور اس راکھ کو جمع کر کے اس کو زندہ کر دیا، پھر اللہ نے پوچھا کہ میرے بندے تو نے تدبیر کیوں کی تھی؟ اس نے وہی جواب دیا کہ پروردگارِ عالم! میں نے آپ کے خوف سے ایسا کیا کہ اگر آپ کا بس چل گیا تو آپ بڑا دردناک عذاب دیں گے۔'' (مشکوٰۃ: ۲۰۷) اس حدیث کو ذکر کر کے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ اس شخص کی بخشش ہوگئی؛ اس لیے کہ وہ مومن تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: جہاں میری صفت ''شدید العذاب'' ہے، وہیں میں ''غفور رحیم'' بھی ہوں، تم اس صفت کو کیوں نہیں دیکھتے؟ اور اللہ نے اس کی بخشش کر دی، محض اس وجہ سے کہ وہ اللہ سے اس قدر ڈرا۔

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ یہ ایمان کیسے ہوا؟ وہ تو اللہ کو قادرِ مطلق نہیں مان رہا ہے؟ وہ تو مان رہا ہے کہ میری راکھ اس طرح بکھیر دی جائے گی تو خدا کا بس اس پر نہیں چلے گا اور وہ میری مٹی کو نہیں جمع کر سکے گا، وہ قادرِ مطلق نہیں مانتا تو بھی وہ مومن کیسے ہوا؟ اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک جملہ جواب کے طور پر لکھا کہ ہر شخص سے مطلوب وہ بات ہے، جو اس کی استعداد میں ہے، ہر شخص کی جتنی استعداد ہے، اتنا ہی اس سے مطلوب ہے۔ آپ حضرات سے ہم پوچھیں کہ: ''أین اللہ؟'' اور آپ کہیں کہ ''هو في السماء''، وہ جواب درست نہیں ہوگا؛ اس لیے کہ آپ کی استعداد اس سے بہتر جواب کی ہے؛ لیکن اس باندی کا جواب قبول کر لیا گیا، اس لیے کہ باندی گونگی تھی، اس کی استعداد اتنی ہی بات کی تھی اور وہ آدمی اتنی ہی استطاعت رکھتا تھا کہ راکھ کے جمع کرنے پر خدا کو قادر نہ مانے، تو اللہ نے جتنی استطاعت دی، اس کے موافق اس کا جواب قبول کر لیا۔

حسناتِ ابرار، سیئاتِ مقربین

مجھے اس سے یہ سمجھانا ہے کہ انسانوں میں جو امانت اُٹھانے کی استعداد ہے، اس کا کمتر درجہ یہ ہے اور اعلیٰ درجہ وہ ہے جو انبیائے کرامؑ اور ان کے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیائے کرامؒ اور بڑے بڑے لوگوں کو حاصل ہے، اس مقام کی تشریح مشکل ہے۔ البتہ ایک مشہور جملہ ہے: ''حسنات الأبرار سیئات المقربین.'' اس جملے میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ ابرار ایک کام کرتے ہیں تو وہ اُن کے لیے حسنہ ہے؛ لیکن وہی کام اگر مقربین کریں تو وہ حسنہ نہیں، بلکہ ان کے لیے سیئہ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد آپ کے ذہنوں میں ہوگا کہ: ''ما عرفناك حقَ معرفتك'' آپ کے پہچاننے کا جو حق ہے، ہم اس تک نہیں پہنچے، اس حق تک پہنچیں گے جب اس کا خاص وقت آئے گا اور وہ وقت ہے مرنے کے بعد قبر کی زندگی یعنی عالم برزخ میں۔ یہ معرفت بڑھتی چلی جائے گی اور پھر میدانِ حشر میں بھی بڑھے گی، پھر جنت کی ابدی زندگی میں بڑھتی چلی جائے گی، حضرت شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ جنت میں پہنچنے کے

ایک لمبے عرصہ بعد جو علوم حاصل ہوں گے وہ درجہ تو ہم سمجھ بھی نہیں سکتے۔ جس درجے میں امانت اٹھائی، اسی درجہ میں حق ادا کریں!

اس تفصیل کے عرض کرنے کا مقصد یہ جاننا ہے کہ آپ حضرات کس درجہ میں ہیں؟ یہ جو امانت اٹھائی ہے سبھی انسانوں نے اٹھائی ہے، آپ نے بھی اٹھائی ہے، ہم نے بھی اٹھائی ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ ہم نے کس درجہ میں وہ امانت اٹھائی ہے؟ اگر ہم اس درجہ کا حق ادا کریں گے، تو سرخرو ہوں گے۔ اگر اس درجہ کا حق ادا نہیں کریں گے تو ناکام رہیں گے۔ اگر ہم مقربین میں ہیں اور ابرار والے حسنات کر رہے ہیں، تو آپ کے لیے کافی نہیں، وہ تو آپ کے لیے سیئات بن جائیں گی۔ آپ مقربین میں ہیں تو مقربین والا عمل کرنا ہوگا، اس کو سمجھنا آپ کے لیے آسان ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ علم کا سب سے نچلا درجہ فرض عین ہے، جس کی تحصیل ہر انسان پر لازم ہے، یہ جو فرضِ عین ہے اس کے بھی درجے ہیں، پھر اس کے اوپر جو درجہ ہے وہ فرضِ کفایہ ہے اور آپ جو کچھ حاصل کر رہے ہیں وہ فرضِ کفایہ کا اونچا درجہ ہے، پہلے جو تعلیمی صورت حال تھی اس کے مقابلہ میں صورت حال بدل گئی ہے اور اب آپ جیسے طلبہ کے لیے بھی نگرانی متعین کرنی پڑتی ہے۔

حضرت علامہ عبدالحئ فرنگی محلیؒ کے استغراقِ علم کا واقعہ

موتی سمندر کے اوپر نہیں ملتے۔ (اس کے بعد حضرت پالن پوری صاحبؒ نے مولانا عبدالحئ فرنگی محلیؒ کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ!)

حضرت مولانا عبدالحئ صاحب فرنگی محلیؒ ایک روز کمرے میں مطالعہ کر رہے تھے، دورانِ مطالعہ پانی طلب کیا، ان کے والد حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب تشریف فرما تھے، ان کو فکر ہوئی کہ مطالعہ کے دوران ذہن کسی اور طرف کیسے گیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہ پڑھے گا، حکم دیا کہ بجائے پانی کے ارنڈی کا تیل جو وہاں رکھا ہوا تھا دے دیا جائے، مولانا عبدالحئ صاحب نے گلاس منہ میں لگایا، تیل پی گئے اور یہ احساس نہ ہوا کہ تیل ہے یا پانی؟ اس کے بعد پھر مطالعہ میں مشغول ہو گئے، والد کی فکر دور ہوئی اور کہا کہ اُمید ہے کہ پڑھ لے گا، والد صاحب چونکہ بہت بڑے طبیب بھی تھے؛ اس لیے صاحبزادے کو دوا پلا کر تیل کا اثر زائل کر دیا۔

(اس واقعہ سے نتیجہ نکالتے ہوئے فرمایا:)

میرے عزیزو! آپ کا مقام یہ ہے کہ آپ ایک ماہر غواص بن جایئے، جو اتنی گہرائی میں چلا جائے کہ دنیا و مافیہا سے وہ بے خبر ہو جائے، اسے کچھ پتہ نہیں کہ ٹائم کیا ہوا ہے؟ ایسے دماغ کے ساتھ کسی چیز کی گہرائی میں اُترے گا تو موتی ملیں گے۔ موتی سمندر کے اوپر نہیں ملتے جب تک آپ غوطہ لگا کے گہرائی میں نہیں جائیں گے، تب تک نہیں ملے گا اور جو گہرائی میں جائے گا اسے اس وقت دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہونا پڑے گا، شمع علم کے لیے پروانہ وار نثار ہونا سیکھیے! تو آپ کا مقام یہ ہے، اس کو پرانے فضلاء جانتے تھے۔ آج صورت حال تو

زمانے کے ساتھ تبدیل ہوئی وہ افسوسناک ہے؛ لیکن یہ صورت حال سو فیصد نہیں بدلی، بلکہ الحمد للہ آج بھی ہمارے طبقہ میں ایسے ممتاز فضلاء ہیں جو اپنے مقام کو پہچانتے ہیں اور اپنے مقام کے مناسب محنتیں کرتے ہیں، آج اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے آج آپ حضرات کے لیے ان بزرگوں کی برکت سے ہمہ جہت آرام وسکون میسر فرمایا ہے، آپ کے پاس بہترین بیڈ ہیں۔ شاندار کھانے ہیں، اُڑانے کے لیے وظیفے ہیں، ایسی کوئی راحت نہیں جو آپ کو حاصل نہیں، لیکن آپ ان راحتوں سے مولانا فرنگی محلیؒ کا مقام حاصل کرنا چاہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ کا مقام حاصل کرنا چاہیں ناممکن ہے، وہ مقام تو حاصل ہوتا ہے جدوجہد سے اور علم کے پیچھے مرمٹنے سے اور اس کے پیچھے اپنی تمام توانائیاں صرف کرنے سے اور ہر چیز کی گہرائی میں اُترنے سے۔

مستقبل کے اکابر

ہماری آنکھیں تو کل بند ہوجانے والی ہیں، آنے والی دنیا کی زمام آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ مستقبل کے اکابر ہیں۔ اس لیے میرے بھائیو! اپنا مقام پہچانو، اپنے وقت کی قدر کرو! جس مقصد کے لیے آپ یہاں آئے ہیں اس کو حاصل کیجیے، ہوش کے ناخن لیجیے، اپنی گتھیاں سلجھائیے، علم میں گیرائی اور گہرائی پیدا کیجیے! فقاہت سے حظِ وافر حاصل کیجیے، اساتذہ کی قدر کیجیے، ان سے خوب استفادہ کیجیے اور منزل کی طرف رواں دواں رہیے۔ منزل دور نہیں ہے۔ منزل آپ کا انتظار کر رہی ہے کیوں؟ اس لیے کہ آپ نے امانت اٹھائی ہے اور امانت اٹھانے کا بہت اونچا مقام اور درجہ ہے، لہٰذا آپ نے جس درجہ میں امانت اٹھائی ہے اسی درجہ میں اس کا حق ادا کیجیے۔ اللہ نے آپ حضرات کو اعلیٰ درجہ کی استعدادیں دی ہیں اور آپ پر بڑی ذمہ داری عائد کی ہے۔ ہماری آنکھیں تو کل بند ہوجانے والی ہیں۔ آنے والی دنیا کی زمام آپ کے ہاتھ میں ہے، آج آپ اپنے کو تیار نہیں کریں گے؛ کل کی راہنمائی کے قابل اپنے آپ کو نہیں بنائیں گے؛ تو امت کی گاڑی کیسے چلے گی؟ دین کی محنتیں کون کرے گا؟ دین کا صحیح مفہوم جو حضور ﷺ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حاصل کیا، صحابہؓ سے تابعینؒ نے حاصل کیا اور نسلاً بعد نسلٍ وقرناً بعد قرنٍ، اُمتاً بعد امتٍ جو امانت چلی آرہی ہے، دین کا جو صحیح فہم چلا آرہا ہے، اسے حاصل کرنا دین میں فقاہت پیدا کرنا؛ یہی آپ کی زندگیوں کا مقصد ہے۔

میں اُمید کروں گا کہ آپ حضرات اپنے اس مقصد کو سمجھیں گے، اپنے مقام ومرتبہ کو سمجھیں گے، وقت کو ضائع کرنے سے بچیں گے۔ اللہ آپ کے علم میں برکت عطا فرمائے اور اوقات میں برکت عطا فرمائے اور اللہ آپ کو اس قابل بنائے کہ آنے والی امت کی آپ حضرات قیادت کرسکیں اور دین کی امانت جو آپ حضرات کے سپرد ہے، آپ اس کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کردیں، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين!

(بشکریہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند)